سلسلۂ مطبوعات: ۲۹۷

C 19-8-96

انتخاب منظومات

برج نرائن چکبست

مرتبہ

کشور آرا

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

انتخاب منظومات برج نرائن چکبست

مرتبہ کشور آرا

پہلا ایڈیشن	۱۹۸۹
تعداد	ایک ہزار
قیمت	سات روپے

رام کرشن ورما، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈہ (فیض آباد) سے چھپوا کر بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

جدوجہد آزادی کی تاریخ میں جب اردو شعروادب کے کردار کا ذکر آئے گا تو پنڈت برج نراین چکبست کی خدمات پر بڑے فخر و احترام کے ساتھ اظہار خیال کیا جائے گا۔ ان کی قومی اور حب وطن سے معمور نظموں کو جو حسن قبول نصیب ہوا، وہ چکبست کی اہمیت کا خود ایک بڑا ثبوت ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں لیکن ہر نظم میں وہ کسی نہ کسی عنوان سے کوئی ایسی بات ضرور کہہ دیتے ہیں جس سے ہندوستان کی عظمت آئینہ ہو جاتی ہے۔

ہمارے تعلیمی نصاب کی ہر سطح پر چکبست کی نظموں کا مطالعہ لازمی سا ہو گیا ہے۔ ان کی نظموں کے متعدد انتخابات شائع ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک کوئی ایسا انتخاب سامنے نہیں آیا جو ان کے کلام کے مختلف گوشوں کی نمائندگی کر سکے۔ اکادمی محترمہ کشور آرا کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ انھوں نے نصاب کے تقاضوں کو سامنے رکھا اور بڑی محنت سے چکبست کی نظموں کا انتخاب مرتب کیا۔

اتر پردیش اردو اکادمی کے منصوبوں میں یہ امر بھی شامل ہے کہ طلبہ کو ایسی نصابی کتابیں فراہم کی جائیں جو ہر لحاظ سے معیاری ہوں اور جن کی قیمت برائے نام ہو۔ زیر نظر انتخاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

امید ہے کہ اکادمی کی دوسری نصابی کتابوں کی طرح اسے بھی قبول عام ملے گا۔

اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ
۱۰/ اپریل ۱۹۸۹ء

محمود الٰہی
چیرمین
مجلس انتظامیہ

ترتیب

مقدمہ

یوں تو شاعری کی اثرانگیزی کا ایک زمانہ قائل ہے، لیکن اگر شاعر موضوع کے ساتھ ذہنی اور جذباتی وابستگی اور خلوص بھی رکھتا ہو تو اس کی شاعری کی اثرانگیزی درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے — برج نرائن چکبستؔ لکھنوی کی شاعری اس کلیے کی ایک کامیاب مثال ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری نے بھی ایک نیا موڑ اختیار کیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ اور ان کے ہمنواؤں نے اُردو شاعری کو موجودہ زندگی کے مسائل کے قریب لانے اور مشرقی قدروں کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنانے کی ایک تحریک کا آغاز کیا تھا، جس کے نتیجے میں "انجمن پنجاب" جیسے ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کا مقصد شاعری کو گرد و پیش کی زندگی کی عکاسی اور قیادت کے قابل بنانا اور ہمعصر سیاسی اور سماجی شعور سے آشنا کرنا تھا۔

ہر چند کہ اس تحریک کی مخالفت بھی کی گئی تاہم یہ نئی شاعری جلد ہی عوام کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ مولانا حالی نے اس تحریک کو مزید قوت عطا کی، انھوں نے نہ صرف "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر دنیائے شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا بلکہ اپنی اصلاحی اور اخلاقی نظموں سے مسلسل اس تحریک کی آبیاری کرتے رہے۔ اسی دور میں شبلؔی، اکبؔر، سرؔور جہاں آبادی اور اقبالؔ جیسے قدآور شعرا نے بھی اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کی مصوری، حب الوطنی، انگریزی حکومت کی مخالفت اور پیغامِ بیداری جیسے اہم موضوعات سے اردو شاعری کے دامن کو وسعت عطا کی۔ چکبسؔت لکھنوی بھی اسی شعری روایت کے ایک اہم ستون ہیں۔

چکبسؔت کا عہد ہندوستان کے لیے بلاشبہ سیاسی اور سماجی انتشار کا عہد تھا۔ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے تھے، لیکن دوسری جانب ہندوستانی دانش وروں، سیاست دانوں اور پُرجوش نوجوانوں کے دلوں میں شمع آزادی کی کرنیں بھی بیدار ہو رہی تھیں جو انھیں ہر پل، ہر لمحہ بے چین و بے قرار رکھتی تھیں۔ پہلی ناکام بغاوت کے بعد اگرچہ ہندوستانیوں کے حوصلے کسی حد تک پست ہو گئے تھے لیکن اس کے باوصف انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ ان کا وطن عزیز آہستہ آہستہ کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں کی ساری دولت جس کے حقیقی مالک وہ خود تھے سمیٹ کر

سمندر پار بھیجی جا رہی ہے۔ غریبی، جہالت اور دریوزہ گری ان کا مقدر بن چکی ہے، وہ جانتے تھے کہ ان کی ساری محنت کا فائدہ انگریزوں کے حصّے میں آتا ہے اور ان کے اپنے حصّے میں احساس کمتری اور ذلّت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

چکبستؔ بھی ان تمام حالات سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ وہ خود بھی انھیں حالات و احساسات سے دوچار تھے۔ ایسے نازک وقت میں انھوں نے ہندوستانی عوام کا حوصلہ بلند کر کے انھیں احساسِ کمتری سے نکالنے کے لیے ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے، انھیں خواب غفلت سے بیدار کر کے ان میں جوش اور ولولہ بھرنے کا شاندار کارنامہ انجام دیا۔

اپنی نظم "خاک ہند" میں فرماتے ہیں ـ

اس خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں میں جب تھا وحشت کا دور طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادی کہن میں
گوتمؔ نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمدؔ نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو

اکبرؔ نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے راؔنا نے اس چمن کو

سب سور بیرا پنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

سچ تو یہ ہے کہ چکبستؔ کو ہندوستان سے والہانہ عشق تھا، ہندوستان کی کہنہ روایتوں سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی، انھیں خاک وطن کا ہر ذرہ پیارا تھا۔ چنانچہ انھوں نے جہاں شری کرشن اور مہاتما گوتم بدھ کے حوالے سے زندگی کی ارفع قدروں کا درس دیا وہیں خواجہ معین الدین چشتی کی اعلیٰ تعلیمات کی بھی تبلیغ کی۔ یہی نہیں ہمالہ کی سر بفلک چوٹیاں، گنگا جمنا کی چنچل موجیں، یہاں کے جنگل، جھرنے، سورج کی سنہری کرنیں بھی ان کے نزدیک عزیز ہی نہیں، مقدس و باوقار بھی ہیں۔ اور اسی جذباتی لگاؤ اور والہانہ عشق نے ان کی حب الوطنی سے بھرپور نظموں کو بے پناہ تاثیر سے معمور کر دیا ہے۔

بچوں کی ایک نظم "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" میں ہندوستان کے مختلف مناظر کا بیان ملاحظہ ہو ؎

ہوائیں درختوں کا وہ جھومنا وہ پتوں کا پھولوں کا منہ چومنا
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ باغوں میں کوئل وہ جنگل کے مور   وہ گنگا کی لہریں وہ جمنا کا زور

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

اسی سے ہے اس زندگی کی بہار   وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

یہ بات عام ہے کہ مقصدی شاعری کسی حد تک کمزور اور بے کیف ہوتی ہے، لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں، اسے صرف اسی حد تک درست مانا جا سکتا ہے جب شاعر اپنے مقصد سے براہ راست تعلق نہ رکھتا ہو یا اُس نے کسی 'ازم'، یا کسی تحریک کا خول زبردستی اپنی شاعری پر چڑھانے کی کوشش کی ہو، لیکن چکبست کی شاعری اس الزام سے یکسر بری ہے، کیونکہ وہ ملک و قوم کی بدحالی سے براہ راست وابستہ تھے اور اس کا درد بھی رکھتے تھے۔ ان کی نظمیں اسی درد کا متاثر کن اظہار ہیں۔

ان کی نظم 'دردِ دل' کا ایک بند دیکھیے ؎

نہ ہوں شاعر نہ ولی ہوں نہ ہوں اعجاز بیاں

بزمِ قدرت میں ہوں تصویر کی صورت حیراں

دل میں اک رنگ ہے لفظوں سے جو ہوتا ہے عیاں

لے کی محتاج نہیں ہے میری فریاد و فغاں

شوق شہرت ہوسِ گرمیٔ بازار نہیں

دل وہ یوسف ہے جسے فکرِ خریدار نہیں

چکبست کے یہاں مکمل آزادی کا کوئی واضح تصور نہیں ملتا۔ انھیں

انگریزوں یا ان کی حکومت سے کوئی نفرت بھی نہ تھی، وہ تو صرف ہندوستانیوں کی عظمتِ رفتہ کی مراجعت کے آرزومند تھے، اس لیے ان کی نظموں میں معاشرتی اصلاح کی خواہش، قومی بیداری، حبِّ وطن اور اظہار کی آزادی ہی کا پیغام ملتا ہے۔

چکبستؔ کے عہد میں تحریکِ آزادی کے دو اہم رخ تھے، انڈین نیشنل کانگریس ہی میں ایک گروہ وہ تھا جو طاقت کے ذریعے آزادی حاصل کرنے اور انگریزوں کی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا حامی تھا۔ ان کے دل بغاوت کے جذبات سے لبریز تھے، ان میں اربندو گھوش اور بال گنگا دھر تلک جیسے پرجوش رہنما تھے جو جنگ آزادی کو ایک بھیانک آگ کی طرح سارے ملک میں پھیلا کر فرنگی حکومت کو خاکستر کر دینا چاہتے تھے، انھیں انگریزوں سے کسی طرح کی مصالحت گوارا نہ تھی وہ اس ضمن میں کسی قسم کی مصلحت اندیشی کے بھی قائل نہ تھے۔ وہ وطن عزیز پر اپنے خون کی ایک ایک بوند قربان کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن دوسری جانب گوپال کرشن گوکھلے جیسے قدآور لیڈروں کی قیادت میں اعتدال پسند مجاہدوں کا گروہ تھا جو انگریزوں کے خوشامدی تو نہیں تھے لیکن مصلحت اندیشی کے قائل ضرور تھے۔ یہ انگریزوں سے اپنے حقوق چھیننا نہیں بلکہ مانگنا چاہتے تھے۔ انھیں اپنی حالتِ زار سے آگاہ کر کے مراعات کے طالب تھے، وہ ہندوستانیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا انتظام، ان کی صحت کے لیے اسپتال، معیشت کی بحالی کے لیے کارخانے اور دوسری ضروریاتِ زندگی

کی فراہمی کے خواہاں تھے۔ وہ حق و انصاف کے نام پر اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کا مطالبہ کر کے انگریزوں کے زیرِ سایہ ملک کا اندرونی نظام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے تھے اور اِنھیں مطالبات کو انھوں نے ہوم رول تحریک کا نام دیا تھا۔

چکبستؔ کو یوں تو دونوں نظریات کے حامل رہنماؤں سے ہمدردی تھی لیکن ان کی ذہنی اور جذباتی وابستگی درحقیقت ہوم رول تحریک کے ساتھ تھی۔ وہ ہوم رول کو ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہی نہیں ضمانت بھی سمجھتے تھے، اسی لیے ہوم رول کے بدلے وہ بہشت تک لینے کو تیار نہ تھے، اُنھیں ہوم رول میں قوم کی نجات اور عیش و نشاط کے سارے سامان نظر آتے تھے، یہاں تک کہ فرش سے عرش تک انھیں ہوم رول ہی کا جلوہ نظر آتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری میں انھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ انھیں نظریات کی تبلیغ کی ہے۔

'آوارۂ قوم' کے آخری دو بند ملاحظہ فرمائیں ؎

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی
غریبِ ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اور اپنی نظم "ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" میں فرماتے ہیں ؎

اہلِ وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلا جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا

ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

تحریک آزادی کے اس دور میں جہاں ہندوستان کے قابلِ قدر رہنما عوام و خواص کو اپنے حقوق کی جد و جہد کے لیے تیار کر رہے تھے، اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور دل کو چھو لینے والی تحریروں کے ذریعے اپنی آواز دور دور تک پھیلا رہے تھے، وہیں چکبست بھی اپنی اصلاحی اور بیدار کن نظموں کے ساتھ اس انقلابی اقدام میں برابر کے شریک تھے۔ اُن کی نظمیں سیاسی جلسوں میں پڑھی جاتیں اور ملک کے موقر رسالوں میں شائع ہوتیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی یہ نظمیں عوام میں نیا جوش اور نیا ولولہ بھر دیتیں۔

اردو شاعری پر چکبست کا یہ احسان کم نہیں ہے کہ انھوں نے اسے حالات کے کاندھے سے کاندھا ملاکر چلنے میں بھرپور مدد کی اور ایک پورے دور کی سیاسی اور سماجی تاریخ نظموں کی شکل میں مرتب کردی۔

چوں کہ چکبست کی نظمیں ایک خاص نظریے کی تبلیغ واشاعت کے لیے لکھی گئی تھیں اور خواص پسند ہونے کے ساتھ ساتھ عوام سے براہ راست مخاطب تھیں، لہٰذا ان کی زبان صاف ستھری، سلیس اور رواں بول چال کی زبان ہے۔ انھوں نے بھاری بھرکم الفاظ اور دُور از کار تشبیہات و استعارات سے قطعاً اور قصداً اگریز کیا ہے۔ زبان و بیان پر قدرت نے انھیں ہر موضوع سے کما حقہ، گزر جانے کی بے پناہ صلاحیت عطا کی ہے۔

کشور آرا

حُبِّ قومی

۱۸۹۴ء

حُبِّ قومی کا زباں پران دنوں افسانہ ہے
بادۂ الفت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے

جس جگہ دیکھو محبت کا وہاں افسانہ ہے
عشق میں اپنے وطن کے ہر بشر دیوانہ ہے

جب کہ یہ آغاز ہے انجام کا کیا پوچھنا
بادۂ الفت کا یہ تو پہلا ہی پیمانہ ہے

ہے جو روشن بزم میں قومی ترقی کا چراغ
دل فدا ہر اک کا اس پر صورتِ پروانہ ہے

مجھ سے اس ہمدردیٔ الفت کا کیا ہوئے بیاں
جو ہے وہ قومی ترقی کے لیے دیوانہ ہے

لطف یکتائی میں جو ہے وہ دوئی میں ہے کہاں
برخلاف اس کے جو ہو سمجھو کہ وہ دیوانہ ہے

نخلِ الفت جن کی کوشش سے اُگا ہے قوم میں
قابلِ تعریف ان کی ہمت مردانہ ہے

ہے گلِ مقصود سے پُر گلشنِ کشمیر آج
دشمنی نااتفاقی سبزۂ بیگانہ ہے

دُرفشاں ہے ہر زباں حُبِّ وطن کے وصف میں
جوش زن ہر سمت بحرِ ہمتِ مردانہ ہے

یہ محبت کی فضا قائم ہوئی ہے آپ سے
آپ کا لازم تہہِ دل سے ہمیں شکرانہ ہے

ہر بشر کو ہے بھروسا آپ کی امداد پر
آپ کی ہمدردیوں کا دور دورا افسانہ ہے

جمع ہیں قومی ترقی کے لیے اربابِ قوم
رشکِ فردوس ان کے قدموں سے یہ شادی خانہ ہے

قوم کی حالت

ہے لب پہ مرے الفت، قومی کا ترانہ آئینۂ کیفیتِ نیرنگ زمانہ
ہاں گوشِ حقیقت سے سُنیں عاقل و دانا تقدیر کی گردش کا یہ پُر درد فسانہ

کس اوج سے اس قوم کا یہ حال ہوا ہے
کس طرح یہ گلشن مرا پامال ہوا ہے

خاموش تھا جو لب، وہی سرگرم فغاں ہے جو آگ تھی سینے میں نہاں آج عیاں ہے
بسمل کی طرح خاطر ناشاد تپاں ہے ہر مدِّ نفس صورت شمشیر رواں ہے

لختے بر داز من گذرد ہر کہ ز پیشم
من فاش فروشِ دل صد پارۂ خویشم

ہے قوم پہ چھایا ہوا یہ ابر نحوست نظروں سے ہے پنہاں رخِ خورشیدِ سعادت
میدانِ ترقی سے قدم کرتے ہیں رجعت سائے کی طرح ساتھ ہے ادبار کی صورت

وہ بارِ الم ہے کہ اٹھایا نہیں جاتا
بگڑا ہے وہ نقشہ کہ بنایا نہیں جاتا

پیروں میں نہیں روشنیِ چشمِ بصیرت　　عنقا ہے جوانوں میں جواں مردی و ہمت
گمراہ ہوئے جاتے ہیں خود خضرِ طریقت　　ہر صفحۂ دل سے ہے مٹا حرفِ محبت

باقی ہے کہاں نام و نشاں مہر و وفا کا
کچھ رنگ ہی بدلا نظر آتا ہے ہوا کا

آزادی و اصلاح

آزادی و اصلاح کے جب آتے ہیں اذکار — تقلید ہو یورپ کی یہی رہتی ہے گفتار
موجود مگر ان میں وہ جوہر نہیں زنہار — مغرب میں جو تہذیب و ترقی کے ہیں اسرار
وہ حُبِّ وطن خون میں شامل نہیں رکھتے
گو ولولے رکھتے ہیں مگر دل نہیں رکھتے

تھے خطّۂ یورپ میں جو اصلاح کے بانی — آزادیِ قومی پہ لہو کر گئے پانی
مرجھا گئے کتنے ہی گل باغ جوانی — اس نخل سے پر دُور رہا رنگِ خزانی
سرگرمِ شہادت تھے وہ ایثار کی رو سے
سینچا چمن قوم رگِ جاں کے لہو سے

تھے یکّہ و تنہا پہ ہزاروں کو نہ سمجھا — عشقِ گلِ مقصود میں خاروں کو نہ سمجھا
سر کٹ گئے تلواروں کی دھاروں کو نہ سمجھا — جل جل گئے شعلوں کو شراروں کو نہ سمجھا
بدکیش نمود ان کی مٹا اب نہیں سکتے
وہ آگ لگی ہے کہ بجھا اب نہیں سکتے

بالعکس یہاں قوم کی ہمت میں ہے پستی — وہ مرد کہاں ہیں جو سمجھتے ہیں جو ہستی
یہ جوش فقط جہل و تکبر کی ہے مستی — اصلاح کے پردے میں ہے بس نفس پرستی

آثار دلوں میں ہیں کہاں دردِ نہاں کے
دکھلاتے ہیں جوہر یہ فقط سیفِ زباں کے

دکھلاتی ہے بس سیفِ زباں جوہرِ عالی — لاریب صدا دیتا ہے جو ظرف ہے خالی
اصلاح کی تقلید ہے اک امرِ خیالی — جب بانیِ اصلاح ہوں خود ضیغم قالی

گر حسن نہیں عشق بھی پیدا نہیں ہوتا
بلبل گلِ تصویر پہ شیدا نہیں ہوتا

شکوہ تو یہ ہے قوم کی برگشتہ ہے تقدیر — چلتی نہیں اصلاح کی اصلا کوئی تدبیر
لیکن جو ہیں خود رائی و خود بینی کے خوگیر — اُن لوگوں کی گفتار میں کس طرح ہو تاثیر

جو خود نہیں سرگرم کرے گا وہ بشر کیا
جب دل میں نہیں درد زباں میں ہو اثر کیا

مذہب

سودائے محبت میں انھیں کے نہیں خامی | خود بینی سے خالی نہیں مذہب کے بھی حامی
عرفاں کی خبر لاتی ہو گو طبعِ گرامی | ہے نفس کی منظور حقیقت میں غلامی

کچھ قوم کی پروا ہے نہ فکرِ کہ ومہ ہے
ہو جائے نجات اپنی، تمنّا ہے تو یہ ہے

عالم کے دکھانے کے لیے خاک نشیں ہیں | دعویٰ ہے کہ ہم مالکِ فردوسِ بریں ہیں
دنیا کی ترقی پہ سدا چیں بہ جبیں ہیں | گویا کہ یہی رازِ الٰہی کے امیں ہیں

جو اور ہیں وہ معرفتِ حق سے جدا ہیں
بس ایک یہی بندۂ مقبول خدا ہیں

انساں کی محبت کو سمجھتے ہیں یہ آزار | ہمدردیِ قومی سے انھیں آئے نہ کیوں عار
رہتے ہیں سدا فکر میں عقبیٰ کی گرفتار | دنیا کے فرائض سے نہیں ان کو سروکار

یوں جادۂ تسلیم و رضا مل نہیں سکتا
ان میں وہ خودی ہے کہ خدا مل نہیں سکتا

تنبیہ

ہشیار رہو اے قوم! یہ غفلت نہیں اچھی ۔ یہ خیرگیِ نشۂ دولت نہیں اچھی
معزولیِ آئینِ شرافت نہیں اچھی ۔ یہ دشمنِ اخلاق شریعت نہیں اچھی

مانا شبِ ادبار کا ہر سمت اثر ہے
گر خواب سے بیدار رہو اب بھی تو سحر ہے

ہاں ابرِ کرم سے چمنِ قوم ہو شاداب ۔ واللہ یہی حسن شرافت کا ہے آداب
حیوان بھی یوں رکھتے ہیں سب شغلِ خور و خواب ۔ تہذیب کا آئین ہے دل سوزیِ احباب

محروم اسی خُلق سے حیوان ہوا ہے
انسان اسی بات سے انسان ہوا ہے

خالق نے دیے ہیں جنھیں اوصافِ حمیدہ ۔ ہوش اُن کے نہ ہوں نشۂ نخوت سے پریدہ
لِلّٰہ کریں قوم سے دامن نہ کشیدہ ۔ لاتی نہیں پھل پھول کبھی شاخِ بریدہ

احباب کی صحبت کو بشر کھو نہیں سکتا
ناخن سے کبھی گوشت جدا ہو نہیں سکتا

واجب نہیں مذہب کے مسائل میں بھی حجّت
بازیچۂ اطفال ہیں ہفتاد و دو ملّت

بس قابلِ تسلیم اُسی کی ہے شریعت
جس دل میں ہو انساں کے لیے دردِ محبّت

تہذیب پسندیدۂ آفاق یہی ہے
مذہب یہی، ملّت یہی، اخلاق یہی ہے

لارڈ کرزن سے جھپٹ

سنہ ۱۹۰۴ء

وہ شبِ تار میں تاروں کا فلک پر جمگھٹ
چھُپ گیا آنکھ سے، بدلی جو زمیں نے کروٹ
دیکھنا شرق میں وہ صبح کا تارا چمکا!
وہ عروسِ سحرِ نور نے اُلٹا گھونگھٹ
بڑھ کے رضواں نے وہ جنت کے دریچے کھولے
آئی وہ گلشنِ فردوس سے پھولوں کی لپٹ
چونک اُٹھا پیرِ فلک، بانگ لگائی ایسی
مرغ نے گریۂ مسکیں کی جو پائی آہٹ
گدگدایا جو نسیمِ سحری نے آکر
ناز سے سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ
نظر آتا ہے گلستاں میں پرستاں کا سماں
گُل کھلے ہیں کہ ہے پریوں کا چمن میں جمگھٹ

یہ بہارِ چمنستاں، یہ سحر کا عالم
ہاں ذرا بادۂ گلرنگ تو لانا جھٹ پٹ
ہاں، وہ مے ہو کہ جو مل جائے کہیں تھوڑی سی
شیرِ مادر کی طرح شیخ بھی پی لے غٹ غٹ
دیکھنا لے کے صراحی مرا ساقی آیا
جام میں بادہ گلرنگ دیا اُس نے اُلٹ
اب میں پیتا ہوں لبوں تک مرے ساغر پہنچا
ختم مے ہو گئی، لو حلق سے اُتری تلچھٹ
آگیا جوش، طبیعت میں بڑھی گردش خوں
ڈورے آنکھوں کے ہوئے لال، بھری گرماہٹ
نشہ میں چور ہوں اور سوجھتی ہے دور کی اب
ڈر ہے کرزن کی نہ ہو جائے کہیں مجھ سے جھپٹ
لیجیے سامنے میرے ہے شبیہہ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ
سرخ غصے سے کبھی، زرد کبھی صدمے سے
خوف کے مارے کبھی رنگ میں ہے نیلاہٹ
آئے ہیں آپ تو کچھ حضرت کرزن سنیے
آپ اگر منھ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منھ پھٹ

آگیا طیش مجھے، دل کا نکالوں گا بخار!
صاف کہتا ہوں، نہیں بات میں اپنی بنوٹ

مانیے گا نہ بُرا آدمی ہیں آپ شریف
عالمِ نشّہ میں بک جاؤں اگر کچھ سٹ پٹ

ہاں، یہ کیوں آپ کے گم ہو گئے ہیں ہوش و حواس
کنووکیشن میں یہ دکھلائی ہے کیا جھلاّہٹ

گل فشانی کے عوض دور کیا دل کا بخار
خوب پھینکا سرِ احباب پہ کوڑا کرکٹ

دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماشاء اللہ
خوب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے نٹ کھٹ

گالیاں کس لیے در پردہ سنائیں ہم کو
ناچنے نکلے تو پھر منھ پہ یہ کیسا گھونگھٹ

یاد رہ جائے گی لیکن ہے وہ ٹھوکر کھائی
توسنِ طبع کو اب پھر نہ اڑانا سرپٹ

اہل بنگال نے کیا خوب کیا ہے حملہ
کہ تری فوجِ مضامیں نے ہے کھایا گھونگھٹ

منھ دکھانا تجھے واجب نہیں کلکتّہ میں
اب مناسب ترے رہنے کے لیے ہے چنہٹ

خوب بوچھار ہوئی چار طرف سے تجھ پر
پائیر تک کو نہ خوش آئی تری نہمٹ زپٹ

کانگریس والے تو کیا خوش نہیں تجھ سے دل میں
دشمن ملک، علیگڑھ کے پرانے کھوسٹ

تاج و تقعت کا اُٹھا سر سے ترے چلتے وقت
بے چراغ آئے نظر صبح کو جیسے ڈیوٹ

جس سے ناشاد رعایا ہے وہ ہے دَدلا ترا
کر دیا ملک کو اس پانچ برس میں چوپٹ

بس ترا چل نہ سکا قحط و وبا سے کچھ بھی
شہر ویران ہیں، آباد ہوئے ہیں مرگھٹ

اب مناسب ہے یہی کیجیے پنجرا خالی
ہم بھی خوش، آپ بھی خوش، دور کہیں ہو جھنجھٹ

تو جو ہو جانے پہ راضی تو قسم سر کی ترے
کر کے چندہ تجھے ہم لے دیں ولایت کا ٹکٹ

اور جو تجھ کو نہیں منظور یہ احساں لینا
بھیج دیں ہم تجھے بیرنگ بنا کر پیکٹ

یہی اقرار، یہی قول، یہی وعدہ تھا
او سخن ساز! دغا باز! فسوں گر! نٹ کھٹ!

پھونک ڈالے تری اسپیچوں کے بنڈل ہم نے
اب کی ہولی میں جلائے نہیں چیلے بنکٹ

چیمبرؔ کین سے استاد کا شاگرد ہے تو
یاد ہیں ملؔ کے مقولے نہ اصول بیگٹؔ

کونسل کے جو ترے ممبر سرکاری ہیں
وہ بھی لم بخت ہیں سب چور کے ساتھی گٹھ کٹ

یاالٰہی! یہ چلی بادِ مخالف کیسی
آگیا اڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ

ہیں مگر ملک میں دو چار تہمتن یاں بھی
آستیں تیرے مقابل میں جو لیتے ہیں اُلٹ

یاد رکھ حشر تلک بھی نہ تجھے بھولے گی
گوکھلےؔ کی وہ چنگھاڑ اور وہ مہتاؔ کی ڈپٹ

چل یہاں سے تو ولایت میں خبر لیں گے تری
چین سے رات کو سوئے گا نہ تو اک کروٹ

دادخواہوں کا تو بس ہے وہی دربارِ عظیم
پارلیمنٹؔ میں لکھوائیں گے ہم تیری رپٹ

بچ گیا واں بھی تو پھر حشر میں ہوگا انصاف
کام آئے گی خدا سے نہ تری زیٹ زپٹ

تالیاں پیٹیں گے رُسوائی پہ تیری مظلوم
دیدنی ہوگی قیامت میں تری گھبراہٹ
اب بھی آ ہوش میں انداز حکومت کو بدل
مرد ہو کے تجھے واجب نہیں یہ تریاہٹ
سوچ انجام کو اک روز ہے سب کو مرنا
ہے نمک خوار ہمارا تو نہ کر ہم سے کپٹ
بیٹھ کرسی وزارت پہ سنبھل کر پیارے
آہِ مظلوم نے شاہوں کے دیے تخت اُلٹ

اب مرا نشّہ اترتا ہے میں ہوتا ہوں خموش
بس ترے واسطے کافی ہے یہی سرٹیفکٹ
آگیا ہوش مجھے کھل گئیں آنکھیں لیکن
اب وہ کرزّن نظر آتے ہیں نہ وہ اُن کا چرٹ

میرے مولا! مری بگڑی کے بنانے والے
تو ہی تقدیر اب اس خطۂ بیکس کی پلٹ
شاہ اڈورڈ کا اقبال بڑھا دنیا میں
جس پہ سر پھوڑتے ہیں ہم وہ ہے اس کی چوکھٹ

بس زباں اب نہ ہو تو معرکہ آرائے سخن

رشک سے مرقدِ سودا نہ کہیں جائے اُلٹ

اے عروس سخن ! اللہ رے جوبن تیرا

لاٹ صاحب کو کبھی ناتھے ہے تری زلف کی لٹ

حضرت پنچ سے بگڑیں گے تو بن جائیں گے

لاٹ صاحب کو مناسب نہیں یاں گھبراہٹ

خاکِ ہند

سنہ ۱۹۰۵

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے	دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے	اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری	چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں میں جب تھا وحشت کا دور طاری	چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو	سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو	سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے — اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے

اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوسِ گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک

شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں — کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں

اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں — پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے، گو انجمن وہی ہے

حُبِّ وطن نہیں ہے، خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا — دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا — اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں

عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے — بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے — اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر

سر میں خمار ہو کر، دل میں سرور ہو کر

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا — تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو

مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

قومی مُسدّس

۱۹۱۱ء

الٰہی کون فرشتے ہیں یہ گدائے وطن — صفائے قلب سے جن کے یہ بزم ہے روشن
جھکی ہوئی ہے سبھوں کی لحاظ سے گردن — ہر اک زباں پہ ہیں تعظیم اور ادب کے سخن
صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی
خدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی

فقیر علم کے ہیں ان کی داستاں سُن لو — پیام قوم کا دکھ درد کا بیاں سُن لو
یہ دن وہ دن ہے جو ہے یادگار ہاں سُن لو — ہے آج غیرت قومی کا امتحاں سُن لو
یہی ہے وقت امیروں کی پیشوائی کا
فقیر آئے ہیں کاسہ لیے گدائی کا

جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں — طمع میں دولت دنیا کی یہ اسیر نہیں
امیر دل کے ہیں ظاہر کے یہ امیر نہیں — وہ آدمی نہیں ان کا جو دستگیر نہیں
تمام دولت ذاتی لٹائے بیٹھے ہیں
تمہارے واسطے دھونی رمائے بیٹھے ہیں

سوال اِن کا ہے تعلیم کا بنے مندر — کلس ہو جس کا ہمالہ سے اوج میں برتر
اسی امید پہ یہ گھومتے ہیں شام و سحر — صدا لگاتے ہیں راہ خدا میں یہ کہہ کر

"وہ خود غرض ہیں، جو دولت پہ جان دیتے ہیں
وہی ہیں مرد جو ودّیا کا دان دیتے ہیں"

سوال رد نہ ہو اِن کا یہ شرط ہے تدبیر — اسی سے پائیں گے ایمان و آبرو توقیر
یہ ہے ترقّیِ قومی کے واسطے اکسیر — بہے علوم کی گنگا پئیں غریب و امیر

وقارِ قوم بڑھے دور بے زری ہو جائے
اُجڑ گئی ہے جو کھیتی وہ پھر ہری ہو جائے

جو ہو رہا ہے زمانے میں، ہے تمھیں معلوم — کہ ہو گئے ہیں گراں کس قدر فنون و علوم
تمھاری قوم سے دولت ہوئی ہے یوں معدوم — کہ اب ترستے ہیں پڑھنے کو سیکڑوں معصوم

وہ خود ترستے ہیں ماں باپ ان کے روتے ہیں
تمھاری قوم کے بچے تباہ ہوتے ہیں

یہ بے گناہ اسی قوم کے ہیں لختِ جگر — کہ جس نے تم کو کبھی پالا ہے صورتِ مادر
جگر پہ قوم کے افلاس کا چلے خنجر — غضب خدا کا تمھارے دلوں پہ ہو نہ اثر

اسی سے بے خبری جس کے دم سے جیتے ہو
اُسے رلاتے ہو جس ماں کا دودھ پیتے ہو

یہ قحط کیا ہے، یہ طاعون کیا ہے، کیا ہے وبا — تمھاری قوم پہ نازل ہوا ہے قہرِ خدا
جو راہ راست سے ہوتی ہے کوئی قوم جدا — اسی طرح اسے ملتی ہے ایک روز سزا

اسی طرح سے ہوا قوم کی بگڑتی ہے
اسی طرح سے غریبوں کی آہ پڑتی ہے

گناہ قوم کے دھو جائیں اب وہ کام کرو — مٹے کلنک کا ٹیکہ وہ فیضِ عام کرو
نفاق و جہل کو بس دور سے سلام کرو — کچھ اپنی قوم کے بچوں کا انتظام کرو

یہ کام ہو کے رہے چاہے جاں رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

یہ کارِ خیر میں کوشش یہ قوم کا دربار — لگا دو آج تو چاندی کے ہر طرف انبار
یہ سب کہیں کہ ہے زندہ یہ قوم غیرت دار — ہے اس کے دل میں بزرگوں کی آبرو کا وقار

سروں میں حُبِّ وطن کا جنون باقی ہے
رگوں میں بھیشم و ارجن کا خون باقی ہے

مسزِ بسنٹ کے احسان کی تمھیں ہے خبر — کیا نثار بڑھاپا تمھارے بچوں پر
شریک وہ بھی ہیں اس کارِ خیر کے اندر — نہ اُن کی آنکھ ہو نیچی رہے یہ مدِّ نظر

مٹے نہ بات کہیں تم پہ مٹنے والوں کی
تمھارے ہاتھ ہے شرم ان سفید بالوں کی

تمھارے واسطے لازم ہے مالوی کا بھی پاس — کہ جس کی ذات سے اٹکی ہوئی ہے قوم کی آس
لیا غریب نے گھر بار چھوڑ کر بن باس — جو یہ نہیں ہے تو کہتے ہیں پھر کسے سنیاس

تمام عمر کٹی ایک ہی قرینے پر
گرایا اپنا لہو قوم کے پسینے پر

اسی کے ہاتھ میں ہے قوم کا سنور جانا　　تمھاری ڈوبتی کشتی کا پھر اُبھر جانا
جو تم نے اب بھی نہ دنیا میں کام کر جانا　　تو یہ سمجھ لو کہ بہتر ہے اس سے مر جانا

غضب ہوا جو دل اس کا بھی تم سے اُوب گیا
گرا اس آنکھ سے آنسو تو نام ڈوب گیا

گھٹائیں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ و تار　　یہ آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار
مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوے بیدار　　تو جان لو کہ ہے اس قوم کی چتا تیار

مٹے گا دین بھی اور آبرو بھی جائے گی
تمھارے نام سے دنیا کو شرم آئے گی

جو اس طرح ہوا دنیا میں آبرو کا زوال　　تو کام آئے گا عقبیٰ میں کیا یہ دولت و مال
کرو خدا کے لیے کچھ مرے ہوؤں کا خیال　　نہ ہوں تمھارے بزرگوں کی ہڈیاں پامال

یہ آبرو تو ہزاروں برس میں پائی ہے
نہ یوں لٹاؤ کہ رشیوں کی یہ کمائی ہے

لٹاؤ نام پہ دولت اگر ہو غیرت دار　　پکار اٹھے یہ زمانہ کہ ہے یہ ہر اُپکار
ہے زورِ ہمتِ مردانہ قوم کو درکار　　ورق الٹ دو زمانے کا مل کے سب اک بار

اگر ہو مرد نہ یوں عمر رائگاں کاٹو
غریب قوم کے پیروں کی بیڑیاں کاٹو

یہ کارِ خیر وہ ہو، نام چار سو رہ جائے　　تمھاری بات زمانے کے روبرو رہ جائے
جو غیر ہیں انھیں ہنسنے کی آرزو رہ جائے　　غریب قوم کی دنیا میں آبرو رہ جائے

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو
فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھر دو

یہاں سے جائیں تو جائیں یہ جھولیاں بھر کر
لٹائیں علم کی دولت تمہارے بچوں پر

ادھر یہ ناز ہو تم کو کہ خوش گئے یہ بشر
جو ہو سکا وہ کیا نذران کی ٹیک کے سر

یہی ہو فخر جوانوں کا اور پیروں کا
سوال رد نہ کیا قوم کے فقیروں کا!

دردِ دل

(تمہید)

۱۹۱۲ء

دردہے دل کے لیے اور دل انساں کے لیے
تازگی برگ و ثمر کی چمنستاں کے لیے
سازِ آہنگ جنوں تارِ رگِ جاں کے لیے
بے خودی شوق کی مجھ بے سروساماں کے لیے

کیا کہوں کون ہوا سر میں بھری رہتی ہے
بے پیے آٹھ پہر بے خبری رہتی ہے

نہ ہوں شاعر نہ ولی ہوں نہ ہوں اعجاز بیاں
بزم قدرت میں ہوں تصویر کی صورت حیراں
دل میں اک رنگ ہے لفظوں سے جو ہوتا ہے عیاں
لَے کی محتاج نہیں ہے مری فریاد و فغاں

شوق شہرت ہوس گرمیِ بازار نہیں
دل وہ یوسف ہے جسے فکر خریدار نہیں

اور ہوں گے جنھیں رہتا ہے مقدّر سے گِلا
اور ہوں گے جنھیں ملتا نہیں محنت کا صِلا
میں نے جو غیب کی سرکار سے مانگا وہ مِلا
جو عقیدہ تھا مرے دل کا ہلائے نہ ہلا

کیوں ڈراتے ہیں عبث گبر و مسلماں مجھ کو
کیا مٹائے گی بھلا گردشِ دوراں مجھ کو

کیا زمانے پہ کھلے بے خبری کا مری راز
طائرِ فکر میں پیدا تو ہو اتنی پرواز
کیوں طبیعت کو نہ ہو بے خودیٔ شوق پہ ناز
حضرتِ اکبرؔ کے قدموں پہ ہے یہ فرقِ نیاز

فخر ہے مجھ کو اسی در سے شرف پانے کا
میں شرابی ہوں اسی رند کے مے خانے کا

دل مرا دولتِ دنیا کا طلب گار نہیں
بخدا خاک نشینی سے مجھے عار نہیں
مست ہوں حُبِّ وطن سے کوئی میخوار نہیں
مجھ کو مغرب کی نمائش سے سروکار نہیں

اپنے ہی دل کا پیالہ پیے مدہوش ہوں میں
جھوٹی پیتا نہیں مغرب کی وہ مے نوش ہوں میں

قوم کے درد سے ہوں سوز وفا کی تصویر
میری رگ رگ سے ہے پیدا تپِ غم کی تاثیر
ہے مگر آج نظر میں وہ بہارِ دل گیر
کر لیا دل کو فرشتوں نے طرب کے تسخیر
یہ نسیم سحری آج خبر لائی ہے
سال گذرا مرے گلشن میں بہار آئی ہے

ترقیِ انجمن

(انجمن نوجوانانِ کشمیر)

قوم میں آٹھ برس سے ہے یہ گلشن شاداب
چہرۂ گل پہ یہاں پاس ادب کی ہے نقاب
میرے آئینۂ دل میں ہے فقط اس کا جواب
اس کے کانٹوں پہ کیا میں نے نثار اپنا شباب

کام شبنم کا لیا دیدۂ تر سے اپنے
میں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے

ہر برس رنگ پہ آتا ہی گیا یہ گل زار
پھول تہذیب کے کھلتے گئے مٹتے گئے خار
پتی پتی سے ہوا رنگ وفا کا اظہار
نوجوانانِ چمن بن گئے تصویر بہار

رنگ گل دیکھ کے دل قوم کا دیوانہ ہوا
جو تھا بدخواہِ چمن سبزۂ بے گانہ ہوا

بوئے نخوت سے نہیں یاں کے گلوں کو سروکار
ہے بزرگوں کا ادب ان کی جوانی کا سنگار
علم و ایماں کی طراوت کا دلوں میں ہے گزار
دھو گئے چشمۂ اخلاق سے سینوں کے غبار

رنگ دکھلاتی ہے یوں دل کی صفا یاروں میں
روشنی صبح کی جس طرح ہو گلزاروں میں

کس کو معلوم تھی اس گلشنِ اخلاق کی راہ   میں نے پھولوں کو کیا رنگِ وفا سے آگاہ
اب تو اس باغ پہ ہے سب کی محبت کی نگاہ   جو کہ پودے تھے شجر ہو گئے ماشاءاللہ

کیا کہوں رنگ جوانی میں جو اس راغ کے تھے
باغباں ہو گئے گلچیں جو مرے باغ کے تھے

گو کہ باقی نہیں کیفیتِ طوفانِ شباب   پھنس کے جنجال میں دنیا کے یہ قصہ ہوا خواب
مست رہتا ہے مگر اب بھی دلِ خانہ خراب   شام کو بیٹھ کے محفل میں لنڈھاتا ہوں شراب

نشۂ علم کی امید پہ جینے والے
سمٹ آتے ہیں سرِ شام سے پینے والے

اور ہی رنگ پہ ہے آج بہارِ گلشن   سیر کے واسطے آئے ہیں عزیزانِ وطن
فرش آنکھیں کیے بیٹھے ہیں جوانانِ چمن   دل میں طوفانِ طرب لب پہ محبت کے سخن

کون ہے آج جو اس بزم میں مسرور نہیں
روح سرشار بھی کھنچ آئے تو کچھ دور نہیں

مگر افسوس یہ دنیا ہے مقامِ عبرت   رنج کی یاد دلاتا ہے خیالِ راحت
آج یاد آتی ہے ان پھولوں کی مجھ کو صورت   کھلتے ہی کر گئے جو میرے چمن سے رحلت

چشم بد دور گلوں کی یہ بھری ڈالی ہے
چند پھولوں کی مگر اس میں جگہ خالی ہے

یہ وہ گل تھے جنھیں اربابِ نظر نے رویا   بھائی نے بہنوں نے مادر نے پدر نے رویا
خاک رونا تھا جو اس دیدۂ تر نے رویا   مدتوں ان کو مرے قلب و جگر نے رویا

دل پہ کچھ داغِ محبت ہیں نشانی اُن کی
بچپنا دیکھ کے دیکھی نہ جوانی اُن کی!

غیر دنیا میں کبھی سوز ہے اور ہے کبھی ساز نونہالانِ چمن کی رہے اب عمر دراز
بھائی سے بڑھ کے مجھے ہیں یہ مرے مایۂ ناز میرے مونس ہیں یہی اور یہی میرے ہمراز

مر کے بھی روح مری دل کی طرح شاد رہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

نوجوانوں سے خطاب

ہاں جوانانِ وطن خواب سے بیدار ہو اب ۔ سو چکے رات بھی آخر ہوئی ہشیار ہو اب
سحر نور وفا کے لیے تیار ہو اب ۔ دردِ دل کچھ مجھے کہنا ہے خبردار ہو اب
بے خودی دل کی ہے تصویر بیاں میری ہے
مرثیہ قوم کا ہے اور زباں میری ہے

نکتہ چینی سے غرض ہے نہ دل آزاری ہے ۔ صرف منظور نظر خواب سے بیداری ہے
غفلتِ عیش دلوں پر جو یہاں طاری ہے ۔ بے خودی کہتے ہیں اس کو کہ یہ ہشیاری ہے
کیا کیے جاتے ہو کیا منھ سے کہے جاتے ہو
کچھ خبر ہے تمھیں کس سمت بہے جاتے ہو

چمن عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب ۔ خم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
نشۂ علم میں ہر وقت رہو تم غرقاب ۔ شانِ تعلیم یہی ہے یہی تہذیب شباب
لے اڑی دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پیے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

مست کر دیتی ہے ایسا یہ شرابِ سرجوش ۔ نظر آتی ہے مے حسن سے دنیا مدہوش
سیرِ جنت میں رہا کرتے ہیں چشم ولب و گوش ۔ مجھ سے کہتا تھا جوانی میں مرا بادہ فروش

"ہر گھڑی عالمِ بالا پہ نظر رہتی ہے
کہیں انسان کو دنیا کی خبر رہتی ہے"

نشۂ علم میں تم میں سے نہیں کوئی بھی چور — دخل رہتا ہے طبیعت میں تعلّی کو ضرور
ہو گیا ہے جو ذرا چار کتابوں پہ عبور — تو غضب کی ہمہ دانی ہے قیامت کا غرور

شان ارسطو کی بھی فرعون کا ساماں بھی ہے
وہی گھر مصر بھی ہے اور وہی یونان بھی ہے

علم و اخلاق کے دامن پہ تمھارے ہے یہ داغ — جو بزرگوں نے لگایا تھا اجڑتا ہے وہ باغ
تم کو اللہ نے بخشے ہیں وہ دل اور وہ دماغ — جس سے روشن ہو زمانے کی ترقی کا چراغ

اک ذرا جذبۂ اخلاق کو اعلیٰ کر دو
قوم مرحوم کی تُربت پہ اجالا کر دو

تم مدد کے نہیں محتاج یہ میں نے مانا — ہو مگر فکر سے بچوں کی نہ یوں بیگانا
بارِ احساں سے سبکدوش ہو گر ہو دانا — ایک دن قوم کے آگے نہ پڑے شرمانا

تم کو بچوں کا بڑا فرض ادا کرنا ہے
ہے تو ایمان کی، یہ قرض ادا کرنا ہے

انھیں بچوں کی محبت ہوئی ہے دامن گیر — آپ کی سمع خراشی کی جو کی یہ تدبیر
اپنے دردِ دلِ ناشاد کی ہے یہ تفسیر — اشک حسرت سے کیا ہے جسے دل نے تحریر

چاہے مجذوب کی بڑ، چاہے نصیحت سمجھو
یا ہمارے دلِ مردہ کی وصیّت سمجھو

فریادِ قوم

۱۹۱۴ء

ہے آج اور ہی کچھ صورتِ بیاں میری — تڑپ رہی ہے دہن میں مرے زباں میری
چھدیں گے قلب و جگر تیر ہے فغاں میری — لہو کے رنگ میں ڈوبی ہے داستاں میری

مبالغہ نہیں، تمہید شاعرانہ نہیں
غریب قوم کا ہے مرثیہ، فسانہ نہیں

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز — ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد قوم کے دمساز — ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز

"وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا"

جو مٹ رہے ہیں وطن پر یہ ہے صدا اُن کی — لہو پکار رہا ہے یہ ہے وفا اُن کی
بندھی ہے عالمِ تہذیب میں ہوا اُن کی — غضب کی جا ہے جو گردن جھکے ذرا اُن کی

تمھارے دل میں نہ الفت کی ہوک اُٹھے افسوس
وطن کا قافلہ پردیس میں لُٹے، افسوس

ٹرانسوال کے حاکم وفا شعار نہیں　　کچھ ان کے قول کا دنیا میں اعتبار نہیں
ہماری قوم پہ احسان کا اُن کے بار نہیں　　یہ ظلم کیوں ہے ہم ان کے گناہگار نہیں

اگر وہ دولت برطانیہ کے پیارے ہیں
تو اہل ہند اسی آسماں کے تارے ہیں

مگر جفا سے نہیں ظالموں کو مطلق عار　　اُجاڑتے ہیں وہ بستی جو تھی کبھی گلزار
جہاں خوشی کے ترانوں کا گرم تھا بازار　　سنائی دیتی ہے واں بیڑیوں کی اب جھنکار

کیا ہے بند مسافر سمجھ کے راہوں کو
پہنائی جاتی ہے زنجیر بے گناہوں کو

لُٹے ہیں یوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں　　نصیب رات کو پڑ رہنے کا مقام نہیں
یتیم بچوں کے کھانے کا انتظام نہیں　　جو صبح خیر سے گذری اُمیدِ شام نہیں

اگر جیے بھی تو کپڑا نہیں بدن کے لیے
مرے تو لاش پڑی رہ گئی کفن کے لیے

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے　　ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے
تمھیں تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے　　وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوارے

جو چپ رہیں تو ہوا قوم کی بگڑتی ہے
جو سر اٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی　　اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی　　ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھی نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

اگر دلوں میں نہیں اب بھی جوش غیرت کا — تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزت کا
وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا — جنازہ لے کے چلو قوم و دین و ملت کا
نشاں مٹا دو امنگوں کا اور ارادوں کا
لہو میں غرق سفینہ کرو مرادوں کا

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار — پکارتے ہیں مدد کے لیے در و دیوار
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار — زمین ہلتی ہے اڑتا ہے خون بن کے غبار
جگہ سے اپنی ہے چتوڑ کی زمیں سرکی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار — اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار — تو زیرِ موجِ فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

جنھیں رلائے نہ اب بھی یہ قوم کی افتاد — سیاہ قلب وہ ہندو ہیں کنس کی اولاد
مگر وہ کیا ہیں کسی کی بھی گر نہ ہو امداد — اثر دکھائے گی جادو کا قوم کی فریاد
اٹھیں گے خاک کے تودے سے دستگیر اپنے
زمین ہند کی اگلے گی سورہیر اپنے

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو!　　وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو!
ستون ملک کے ہو قدرِ قومیت جانو　　جفا وطن پہ ہے، فرضِ وفا کو پہچانو
نبیؐ کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیّت کے یادگار رہو تم

کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیّت کا　　دیا تھا دشمنِ قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزّت کا　　یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروت کا
اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
ہزار خندہ کفراست بر مسلمانی

اگر نہ قوم کے اس وقت بھی تم آئے کام　　نصیب ہوگا نہ مرنے پہ بھی تمھیں آرام
یہی کہے گا زمانہ کہ تھا برائے نام　　وہ دھرم ہندوؤں کا وہ حمیّت اسلام
ذرا اثر نہ ہوا قوم کے حبیبوں پر
وطن سے دور چھری چل گئی غریبوں پہ

رہے گا مال نہ ہمراہ جائے گی دولت　　گئی تو قبر تلک ساتھ جائے گی ذلت
کرو جو ایک روپے سے بھی قوم کی خدمت　　تمھاری ذات سے ہو اک یتیم کو راحت
ملے حجاب کی چادر کسی کی عصمت کو
کفن نصیب ہو شاید کسی کی میّت کو

جو دب کے بیٹھ رہے سر اٹھاؤ گے پھر کیا　　عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا و جور کی ذلّت مٹاؤ گے پھر کیا　　تم اپنے بچوں کو قصے سناؤ گے پھر کیا

رہے گا قول یہی اُن سے اُن کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمھاری ہے بے حیاؤں کا

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے — نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے — نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

قوم کے سورماؤں کو الوداع

سنہ ۱۹۱۴ء

ساحل ہند سے جرّار وطن جاتے ہیں　　کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں　　تیغ زن، برق فگن، قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلواروں کے سائے میں قضا چلتی ہے

ان کی رگ رگ میں ہیں پیوست شجاعت کے چلن　　رن کا میدان ہے ان کے لیے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت ان کو ہے اک شب کی دلہن　　مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں
ساٹھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا　　طنطنہ جرمنِ خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا　　ندّیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے

جاں نثار آج تمہارا سا زمانے میں نہیں
ہاں دکھادو کہ ہو تاجِ شہِ لندن کے نگیں

دوست کیا چیز ہیں دشمن ہوں فدائے تحسیں
آسماں وجد کرے بول اٹھے رن کی زمیں

یوں تو لڑنے کو بہت شہ کے نمک خوار لڑے
اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار لڑے

جس گھڑی معرکۂ جنگ میں ہو تیغِ علم
سورما لڑتے ہیں اس طرح پکارے عالم

دل ہو ارجن کا جگر بھیم کا انگد کا قدم
موت کے وقت نظر میں ہو شبیہہِ بھیشم

جس کا قابو نہ ہٹا موت کی تدبیروں پہ
سایۂ تیغ میں آرام کیا تیروں پہ

ہو وہ یورش کہ ہو شیرازہ اعدا برہم
اک اُمنڈتے ہوئے دریا کا ہو پیدا عالم

جو کسی سے نہ جھکا وہ سرِ مغرور ہو خم
پہلے برلن میں جو پہنچے وہ تمہارا ہو قدم

"وہ گرو" کہہ کے بڑھو خون کے محضر کھل جائیں
پھر ہری سنگھ کی تلوار کے جوہر کھل جائیں

تم کو اعزاز ملا۔ ہے یہ وطن کا اعزاز
دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمہاری انداز

خاکِ یورپ پہ دلیری سے ہو اپنی ممتاز
تیغِ ہندی کی اصالت پہ زمانے کو ہو ناز

قوم کا اوج بڑھے نامِ وطن زندہ ہو
روح پرتاپ کی جنت میں نہ شرمندہ ہو

یا، ظفریاب تمھیں دیکھ کے دل ہو بشاش
آئے یا، سوئے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش

سر جدا تن سے ہو یا ہو تنِ بسمل صد پاش
گوشۂ امن و اماں کی نہ ہو آنکھوں کو تلاش

موت معراج ہے اس دشت کے راہی کے لیے
آنچ تلوار کی، جنت ہے سپاہی کے لیے

گو کہ دنیا سے مٹے شوکت قیصر کا سُراغ
شعلۂ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گل نہ ہو دل کے شوالے میں حمیّت کا چراغ
بے گناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں داغ

راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کے لیے
خون معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کے لیے

مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام
خطّۂ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام
تیغ خوں ریز نے جس شان سے چھوڑا ہے نیام
اپنے مسکن میں اسی شان سے پائے آرام

شاعر گوشہ نشیں شکرِ خدا کرتا ہے
جنگ ہو تم کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

آوازۂ قوم

۱۹۱۶ء

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار   ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابرِ دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار   ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی   ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بے خودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی   چلے ہیں بہرِ زیارت وفا کے سودائی
وطن کے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے   وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے   نہ کوئی مرغِ خوش الحاں اسیرِ دام رہے
سرِ پہ شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدارِ چمن

ہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی
سنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اُڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگِ آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

جو آج کل ہے محبت وطن کی عالم گیر
یہی گنہ ہے یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پنھائی ہے زنجیر
بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

جو اپنے حال پہ یہ بے کسی برستی ہے
یہ نائبانِ حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے
وہاں سنا ہے محبت کی جنس سستی ہے

جو اس پہ حالِ وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں، بیڑا یہ پار ہو جائے

فدائیانِ حکومت نے ہم کو رنج دیے
مگر جو فرض وفا تھے ادا وہ ہم نے کیے
نثار جاں سے ہوئے دابِ سلطنت کے لیے
شرابِ عیش سمجھ کے لہو کے گھونٹ پیے

ڈگے نہ پاؤں محبّت کے نوکِ خنجر پر
لہو کی مُہر ہے اپنی وفا کے محضر پر

جو اپنے دل سے ہے برطانیہ کا دل راضی
تو کیا کریں گے یہ ہندوستان کے قاضی
نہ کام آئے گی غیروں کی رخنہ اندازی
تمھیں پکار رہی ہے سخی کی فیاضی

بچی کھچی پہ قناعت ہے، یوں نہیں پیتے

پلانے والا پلاتا ہے، کیوں نہیں پیتے

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی نگاہِ شوق کو ہے دورِ نو کی مشتاقی

نئی شراب، نیا دور اور نیا ساقی مٹے سرور میں دیر و حرم کی نا چاقی

یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دیر رہے

یہ مے کدہ رہے آباد، خُم کی خیر رہے

شراب شوق دوا ہے اس انجمن کے لیے سرور اس کا ہے اکسیر روح و تن کے لیے

کھنچی ہے خلد میں اس محفل کہن کے لیے فلک سے اتری ہے یہ شیخ و برہمن کے لیے

رہے گا دور زمانے میں یادگار اس کا

یہ ہوم رول کا سودا خمار ہے اس کا

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے اذاں کے نعرۂ دلکش سے حظ اٹھائے ہوئے

کہیں ہے نغمۂ ناقوس دل لبھائے ہوئے اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے

یہ حکم پیر مغاں کا ہے نشۂ مے میں

یہ راگ آ کے ملیں ہوم رول کی لَے میں

رقیب کہتے ہیں رنگِ وطن نہیں یکساں بنا ہے قوسِ قزح خاکِ ہند کا داماں

جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں نہ ایک رنگِ طبیعت نہ ایک رنگِ زباں

جو ہوم رول پہ یہ چشم شوق شیدا ہو

تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی   تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی   غریبِ ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لَو لگائے ہوئے

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا   رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا   دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

۱۹۱۶ء

اہلِ وطن مبارک تم کو یہ بزمِ اعلا جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اُجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا
ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اس خاکِ دل نشیں پر بادل سا چھا رہا ہے طوفان بے کسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دورِ حسرت دنیا سے جا رہا ہے مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

(چھوٹے بچوں کے لیے)

۱۹۱۶ء

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن　　محبت کی آنکھوں کا تارا وطن

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ اس کے درختوں کی تیاریاں　　وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

ہوائیں درختوں کا وہ جھومنا　　وہ پتوں کا پھولوں کا منہ چومنا

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار　　وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوار

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ باغوں میں کویل وہ جنگل کے مور　　وہ گنگا کی لہریں وہ جمنا کا زور

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

اسی سے ہے اس زندگی کی بہار　　وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

(بچوں کے لیے)

۱۹۱۶ء

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک　　یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے　　یہ سونے سے کہیں قیمت میں سوا ہے

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

جو چڑیاں صبح کو گاتی ہیں اکثر　　اسی کا راگ ہے ان کی زباں پر

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وہ ساون کے مہینے کی گھٹائیں　　وہ کویل اور پپیہے کی صدائیں

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وہ اک مستی کا عالم بادلوں میں　　وہ پھولوں کا مہکنا جنگلوں میں

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وہ چشمے اور وہ امرت سا پانی　　وہ گنگاؔ اور جمناؔ کی روانی

وطن ہم کو، وطن ہم کو مبارک

درختوں پر وہ چڑیوں کا چہکنا وہ بیلے اور چنبیلی کا مہکنا

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

اسی کی خاک سے لیتے ہیں محصول یہی دیتا ہے غلّہ اور پھل پھول

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام اسی مٹی میں وہ کرتے ہیں آرام

وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

پھول مالا

(قوم کی لڑکیوں سے خطاب)

۱۹۱۷ء

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نام رکھا ہے نمایش کا ترقی و رِفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ مِلانا ہرگز

خود جو کرتے ہیں زمانے کی روش کو بدنام
ساتھ دیتا نہیں ایسوں کا زمانا ہرگز

خود پرستی کو لقب دیتے ہیں آزادی کا
ایسے اخلاق پہ ایمان نہ لانا ہرگز

رنگ و روغن تمھیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

جو بناتے ہیں نمائش کا کھلونا تم کو
اُن کی خاطر سے یہ ذلت نہ اٹھانا ہرگز

رخ سے پردے کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

تم کو قدرت نے جو بخشا ہے حیا کا زیور
مول اس کا نہیں قاروں کا خزانا ہرگز

دل تمھارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لیے
اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز

پوجنے کے لیے مندر جو ہے آزادی کا
اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

نقدِ اخلاق کا ہم نلؔ کی طرح ہار چکے — تم ہو دمینتؔ یہ دولت نہ لٹانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ — تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمھارا زانو — پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو — دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے — راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز
پرورش قوم کی دامن میں تمھارے ہوگی — یاد اس فرض کی دل سے نہ بھلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمھارے نہ ہوا اس وقت کا رنگ — ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز
ہوگا 'پرلے' جو گرا آنکھ سے ان کی آنسو — بچپنے سے، نہ یہ طوفان اُٹھانا ہرگز
ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں — تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

کس کے دل میں ہے وفا کس کی زباں میں تاثیر
نہ سنا ہے نہ سنو گی یہ فسانا ہرگز

برق اصلاح

سنہ ۱۹۱۷ء

مرحبا جرأت اصلاح دلانے والو　　قوم کے بارِ امانت کے اٹھانے والو
دل کی اجڑی ہوئی نگری کے بسانے والو　　مادرِ ہند کی بگڑی کے بنانے والو

کیسے طوفان میں دیا ہے یہ سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا تم نے

کل جسے عین لطافت میں خزاں نے لوٹا　　آج اِس باغ کا شاداب ہے بوٹا بوٹا
بیڑیاں کٹ کے گریں قفل اسیری ٹوٹا　　چاند معصوم کی قسمت کا گہن سے چھوٹا

تم بھی خود شاد ہوئے قوم کو بھی شاد کیا
دل کے ویران شوالے کو پھر آباد کیا

قوم میں گلشنِ اصلاح پڑا تھا ویراں　　طائرِ باغ تھے بے بال و پری سے نالاں
ہوگیا اور ہی قدموں سے تمھارے ساماں　　ایسے دل سوز چمن بند میسر ہیں کہاں

قوم دیتی ہے دعا نام تمھارا سن کر
راستہ صاف کیا باغ سے کانٹے چن کر

مل گئے خاک میں کتنے ہی غریبوں کے شباب ان گناہوں کا ہے اس قوم کی گردن پہ عذاب
جو پرانی روشوں کے لیے رہتے ہیں خراب ان کی صورت سے اب آتا ہے زمانے کو حجاب

شانِ اخلاق نہیں جبر کی تدبیروں میں
بے گناہوں کو جکڑتے نہیں زنجیروں میں

بے گنہ ظلم سے ہو جاتے ہیں اکثر معذور مگر انصاف کا دربار بھی ہوتا ہے ضرور
قوم کے جبر کا لیکن ہے نرالا دستور یہ ہو پابندِ جہالت تو ہے دنیا مجبور

دل تو کیا روح بھی اس قید سے آزاد نہیں
یہ ہے وہ ظلم کہ جس کی کہیں فریاد نہیں

آج اس ظلم کی بنیاد ہلی جاتی ہے خاک میں حجّتِ دیرینہ ملی جاتی ہے
رحم کا راج ہے سنگ دلی جاتی ہے یا کلی دل کی محبّت سے کھلی جاتی ہے

مَرد قوموں کو سبق یوں ہی سکھا دیتے ہیں
دل میں جو ٹھانتے ہیں کر کے دکھا دیتے ہیں

نوجوانوں پہ ہے کیا جوش کا عالم طاری معرکہ سر ہو یہ ہے چار طرف تیاری
طنطنہ دل میں ہے لب پر یہ سخن ہے جاری نام کشمیر کا ڈوبے گا جو ہمّت ہاری

آ کے میدانِ ترقی میں پلٹنے کے نہیں
یہ قدم وہ ہیں جو بڑھ جائیں تو ہٹنے کے نہیں

ہے ادھر جوش پہ آزاد خیالی کی ترنگ سر میں سودا ہے دلوں میں ہے جوانی کی امنگ
اس طرف بزمِ حریفاں کا ہے اکھڑا ہوا رنگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں نفریں کے لیے ہم آہنگ

کوئی باقی نہیں اب ان کے طرف داروں میں
مل گئی ٹوٹ کے توبہ بھی گنہگاروں میں

آئیں پیرانِ طریقت یہ تماشا دیکھیں | ہاں نئے دور کا اٹھتا ہوا پردا دیکھیں
جوش اصلاح کا بہتا ہوا دریا دیکھیں | پار ہوتے ہوئے مظلوم کا بیڑا دیکھیں

دیکھ لیں دھرم کی اس قوم میں خو باقی ہے
ان رگوں میں ابھی رشیوں کا لہو باقی ہے

ضعفِ اخلاق سے تھے قوم کے اعضا بیکار | دل کی راحت طلبی سے تھیں امنگیں لاچار
بعد مدت ہوئے غیرت کے نمایاں آثار | نوک نشتر سے ہوا خون رگوں میں بیدار

یوں ہی اصلاح کی تاثیر عیاں ہوتی ہے
قوم پیری میں اسی طرح جواں ہوتی ہے

حالتِ زخم سے جب حالت ناسور ہوئی | فکرِ مرہم دل پر درد کو منظور ہوئی
جورِ مذہب کی بلا قوم سے کافور ہوئی | شکر ہے گائے کی گردن سے چھری دور ہوئی

غم نہیں دل کو یہاں دین کی بربادی کا
بت سلامت رہے انساں کی آزادی کا

مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیامِ وفا

۱۹۱۷ء

زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
قوم غافل نہیں ماتا تری غم خواری سے

خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے
آگ بھڑکی ہے تری آہ کی چنگاری سے

دل ترا قوم کے دامن میں دیے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تری زنداں میں لیے جاتے ہیں

ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر ہمیں تیرا دامن
لہلہاتا ہے محبت کا تری، دل میں چمن

تیرے بالوں کی سپیدی ہے کہ ہے صبحِ وطن
تیری تصویر سے ہیں قوم کی آنکھیں روشن

دلِ پر درد کی تصویر ہے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ہے پہنے ہوئے مورت تیری

مذہبی بیر کی بنیاد مٹائی تو نے
داستاں دین کی دنیا کو سنائی تو نے

راہ انصاف کی اندھوں کو دکھائی تو نے
آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بجھائی تو نے

کس نے گرتی ہوئی قوموں کو سنبھالا ہوتا
تو نہ ہوتی تو نہ دنیا میں اُجالا ہوتا

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے   جیسے برسوں کا مریض اٹھتا ہے بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے   چاندنی پھیل گئی حُسنِ وفاداری سے

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

پھول پتے ہیں ترے رنگِ وفا سے آباد   دردمندوں کی طرح کرتے ہیں پتھر فریاد
بے وفاؤں کی ہوئی جاتی ہے کوشش برباد   تو گرفتار سہی، ہے تری شکتی آزاد

راحتِ جسم کا در بند رہے یا نہ رہے
ڈھیر مٹی کا نظر بند رہے یا نہ رہے

تو نے پودا جو لگایا تھا وہ پھل لایا ہے   آبرو قوم نے پائی ہے وہ دن آیا ہے
ہم نے بھولے ہوئے ویرثے کا نشاں پایا ہے   مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے، آج ملے، صبح ملے، شام ملے

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رُک جائے   دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے   پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی   اب ہوا اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی
مادرِ ہند کی تصویر یہ ہو سینے پہ بنی   بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی

ہو یہ صورت سے عیاں، عاشقِ آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوقِ وفا کا یہی جوہر ہوگا — فرش کانٹوں کا ہمیں پھول کا بستر ہوگا
پھول ہو جائے گا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا — قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

جن کا دامانِ وفا قوم کا گہوارا ہے — ان کو عصمت کی طرح پاسِ وطن پیارا ہے
ان کی فریاد سے زخمی دلِ صد پارا ہے — چشمِ معصوم کا آنسو نہیں انگارا ہے

سَت جسے کہتے ہیں وہ آگ ہے دمسازان کی
پردۂ غیب کی آواز ہے آواز ان کی

جس میں سودائے محبت تھا وہ سر باقی ہے — رات اندھیری ہے مگر یادِ سحر باقی ہے
دل کے ہر زخم میں فریاد کا در باقی ہے — قومِ بیدار کے سینے میں جگر باقی ہے

دل دہلتے نہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤں وفاداروں کے

جوشِ سودائے محبت میں پڑے گر افتاد — دلِ سرمست کہے "خانۂ احساں آباد"
بے زباں کرتے ہیں شاعر کی زباں سے فریاد — یہ زباں وہ ہے جو زنداں میں رہے گی آزاد

پاک ہے جوشِ سخن خوف کی تدبیروں سے
ولولے روح کے آزاد ہیں زنجیروں سے

وطن کا راگ

سنہ ۱۹۱۷ء

زمین ہند کی رُتبے میں عرشِ اعلا ہے　　　یہ ہوم رول کی امید کا اجالا ہے
مسنر بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے　　　فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے　　　ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لیے درد دکھ اٹھائیں گے　　　یہی پیامِ وفا قوم کو سنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر وطوق گہنا ہے　　　وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے　　　مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے　　　خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے

جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے　　یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زباں کو بند کیا ہے، یہ غافلوں کو ہے ناز　　ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز

رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز　　چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی دعا ہے وطن کے شکستہ حالوں کی　　یہی اُمنگ جوانی کے نونہالوں کی

جو رہنما ہے محبت یہ مٹنے والوں کی　　ہمیں قسم ہے اُسی کے سفید بالوں کی

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی پیام ہے کویل کا باغ کے اندر　　اسی ہوا میں ہے گنگا کا زور آٹھ پہر

ہلالِ عید نے دی ہے یہی دلوں کی خبر　　پکارتا ہے ہمالہ سے ابر اٹھ اٹھ کر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر　　وطن کا پاس ہے ان کو سہاگ سے بڑھ کر

جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر　　یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے ان کے سینے پر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

حالتِ قوم

زندگی کا نہیں دنیا میں بھروسا اک آن
آج وہ اٹھ گئے کرتے تھے جو کل کا سامان
عرضِ حال آج ہے لازم کہ ابھی تر ہے زبان
آپ کے فیض کا سر ڈھونڈھ رہا ہے احسان
آپ ہیں ابرِ کرم پاس چمن لازم ہے
سرپرستیٔ عزیزانِ وطن لازم ہے

آپ جس قوم کے ہیں رکنِ رکین اور افسر
ہیں اسی قوم کے یہ طفل و جواں نورِ نظر
ان میں پیدا ہوئے گر علم و ادب کے جوہر
مادرِ قوم کی چھاتی سے ہٹے کا پتھر
آپ کو چین نہیں ان کی اگر خیر نہیں
قوم کے لختِ جگر ہیں یہ کوئی غیر نہیں

گلشنِ قوم میں ہے پیشِ نظر رنگ عجیب
فتنے جاگے ہوئے ہیں خوابِ گراں میں ہے نصیب
دل مروّت سے خفا ہیں تو مروّت کے رقیب
دور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں ہر وقت قریب

اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں
دل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں

کس کو دکھ درد کی غیروں کے خبر رہتی ہے
حالتِ اہلِ وفا نوعِ دگر رہتی ہے
رات دن عیش پرستی پہ نظر رہتی ہے
ہوسِ دولت و زر شام و سحر رہتی ہے

نوجوانوں میں وہ اگلی سی محبّت ہے کہاں
جو بزرگوں نے کمائی تھی وہ دولت ہے کہاں

کوئی سودائے محبّت کا خریدار نہیں
جوشِ الفت کی ذرا گرمئ بازار نہیں
بیٹھ کے پیچھے برا کہنے میں کچھ عار نہیں
جو ہے رفتار خیالات وہ گفتار نہیں

فرق کیا ظاہر و باطن کا برا ہوتا ہے
جو زباں کہتی ہے دل سن کے اسے روتا ہے

دولتِ علم و ہنر میں بھی نمایاں ہے زوال
ہو رہا ہے چمنستانِ ذہانت پامال
سر میں سودا وہ نہیں جس سے میسّر ہو کمال
پڑھنے لکھنے کا فقط دولتِ دنیا ہے مآل
عمر یوں علم کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
اک تجارت ہے کہ دن رات چلی جاتی ہے

کفر ہے جوہرِ ذاتی کے لیے نشو و نما
ذاتِ انساں کی محبت ہے نہ ہے خوفِ خدا
سرِ مغرور سے ہے دور وفا کا سودا
شانِ ظاہر کی تمنا میں، ہیں دولت پہ فدا
جان سے شوقِ نمائش میں گزر جائیں ابھی
قبر چاندی کی جو مل جائے تو مر جائیں ابھی

حجِ اکبر سے جو یورپ کے ہوئے ہیں ممتاز
ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر اُنھیں ناز
بیر یارانِ طریقت سے ہے غیروں سے ہے ساز
وہ بنائی ہوئی چتون وہ انیلے انداز
لب و لہجہ میں لگاوٹ ہے طرح داری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

ان کو تہذیب سے یورپ کی نہیں کچھ سروکار
ظاہری شانِ نمائش پہ دل وجاں ہیں نثار
ہیں وہ سینے میں کہاں غیرتِ قومی کے شرار
جن سے مغرب میں ہوئے خاک کے پتلے بیدار

سیرِ یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہو و لعب سیکھا ہے

مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے

گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶ء ـ ۱۹۱۵ء) کو ہندوستانی قومی تحریک میں اہم درجہ حاصل ہے۔ وہ امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور فرگوسن کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ ۱۸۹۰ء میں سیاست میں داخل ہوئے اور لارڈ کرزن کی پالیسی کے مخالف کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوگئی۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (انجمن خادمان ہند) کے وہ بانی تھے، وہ کانگریس کے اعتدال پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ہوم رول کے پرزور حامی تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ان کے انتقال پر سارے ملک پر رنج و افسوس کی فضا طاری ہوگئی۔ یہ نظم اسی موقع پر لکھی گئی تھی۔ (مرتب)

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے

حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

بڑھتی ہوئی تھی نحوست زوالِ پیہم کی
ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی
نگاہِ یاس تھی ہندوستاں پہ عالم کی
عجیب شئے تھی مگر روشنی ترے دم کی

تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے رفاہ کے گل حسنِ انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر
وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر
بدن میں جان رہی وقعتِ آبرو ہو کر
دلوں میں جوش محبت رہا لہو ہو کر

خدا کے حکم سے جب آب و گِل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں
اُمنڈ اُمنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغِ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں
دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں

اِس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
اُفق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا تھا

حدیثِ قوم بنی تھی تری زباں کے لیے
زباں ملی تھی محبت کی داستاں کے لیے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لیے
کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کے لیے

وطن کی خاک تری بارگاہ اعلا ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

غریب ہند نے تنہا نہیں یہ داغ سہا — وطن سے دور بھی طوفان رنج و غم کا اُٹھا
حبیب کیا ہیں، حریفوں نے یہ زباں سے کہا — سفیر قوم، جگر بندِ سلطنت نہ رہا

پیام شہ نے دیا رسم تعزیت کے لیے
کہ تو ستون تھا ایوان سلطنت کے لیے

دلوں میں نقش ہیں اب تک تری زباں کے سخن — ہماری راہ میں گویا چراغ ہیں روشن
فقیر تھے جو ترے در کے خادمانِ وطن — انھیں نصیب کہاں ہو گا اب ترا دامن

ترے الم میں وہ اس طرح جان کھوتے ہیں
کہ جیسے باپ سے چھٹ کر یتیم روتے ہیں

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو — مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو — مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

رہے گا رنج زمانہ میں یادگار ترا — وہ کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا — خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا

پلی ہے قوم تیرے سایہ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

مرثیہ بال گنگا دھر تلک

ہندوستانی سیاست کے آسمان پہ تلک (۱۹۱۹ء - ۱۸۵۳ء)
کی حیثیت آفتاب کی سی تھی۔ کانگریس کے جلسوں میں انگلستان کے قومی ترانے
کے گائے جانے کے خلاف انھوں نے سب سے پہلے آواز اٹھائی تھی۔ وہ انگریزی
حکومت سے سخت متنفر تھے اور انتہا پسند نقطۂ نظر رکھتے تھے، کانگریس اُن
کے خیالات کا ساتھ نہ دے سکی اس لیے ۱۹۰۷ء میں وہ کانگریس سے الگ
ہو گئے اور ہوم رول لیگ قائم کی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو آزادی
کی بھیک مانگنے کے بجائے اسے بزور حاصل کرنا چاہیے اور اس کی تبلیغ
وہ تمام عمر کرتے رہے (مرتب)

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار روشنیٔ صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سو یا ہے وطن کا سردار طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بے کسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اٹھ گیا دولتِ ناموس وطن کا وارث قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شیر دکن کا وارث پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

موت مہر آشٹ کی تھی یا ترے مرنے کی خبر مردنی چھا گئی انساں تو کیا پتھر پر
پتیاں جھک گئیں مرجھا گئے صحرا کے شجر رہ گئے جوش میں بہتے ہوئے دریا تھم کر

سرد و شاداب ہوا رک گئی کہساروں کی
روشنی گھٹ گئی دو چار گھڑی تاروں کی

تھا نگہبانِ وطن دبدبۂ عام ترا نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا

یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

زندگی تیری بہار چمنستانِ وفا آبرو تیرے لیے قوم سے پیمانِ وفا
عاشقِ نامِ وطن، کشتۂ درمانِ وفا مرد میدان وفا، جسم وفا، جان وفا

ہو گئی نذرِ وطن ہستی فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

اوجِ ہمت پہ رہا تیری وفا کا خورشید موت کے خوف پہ غالب رہی خدمت کی امید
بن گیا قید کا فرمان بھی راحت کی نوید ہوئے تاریکیٔ زنداں میں ترے بال سپید

پھر رہا ہے مری نظروں میں سراپا تیرا
آہ وہ قیدِ ستم اور بڑھاپا تیرا

معجزہ اشکِ محبت کا دکھایا تو نے
ایک قطرہ سے یہ طوفان اٹھایا تو نے
ملک کو ہستی بیدار بنایا تو نے
جذبۂ قوم کے جادو کو جگایا تو نے

اک تڑپ آگئی سوتے ہوئے ارمانوں میں
بجلیاں کوند گئیں قوم کے ویرانوں میں

لاش کو تیری سنواریں نہ رقیبانِ کہن
ہو جبیں کے لیے صندل کی جگہ خاکِ وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

شورِ ماتم نہ ہو، جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھیشم کو چِتا تیروں کی